قرآن کریم پر ''ستیارتھ پرکاش'' کے اعتراضات کی حقیقت

از

سیدنا حضرت میرزا بشیر الدین محمود احمد
خلیفۃ المسیح الثانی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نَحۡمَدُہٗ وَ نُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

قرآن کریم پر ’’ستیارتھ پرکاش،، کے اعتراضات کی حقیقت

پنڈت دیانند صاحب بانی آریہ سماج نے اپنی کتاب ستیارتھ پرکاش میں مسیحیت اور اسلام پر بہت سے اعتراض کئے ہیں۔ ہمارا ارادہ ہے کہ جو اعتراضات سوامی صاحب نے اپنی لاعلمی سے اسلام پر کئے ہیں، اس مضمون میں ان کا جواب دیا جائے اور اسلامی تعلیم کو اصل رنگ میں پیش کر کے دکھایا جائے کہ کیا اس پر کسی قسم کے اعتراض پڑتے ہیں یا پنڈت صاحب نے محض تعصّب سے اپنے دماغ سے اس قسم کے اعتراض پیدا کئے ہیں۔

اعتراضِ اوّل پنڈت صاحب کا سب سے پہلا اعتراض بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ پر ہے۔ اپنے آپ کو محقق قرار دے کر اس پر یوں اعتراض کئے ہیں۔

محقق۔ مسلمان لوگ ایسا کہتے ہیں کہ یہ قرآن خدا کا کلام ہے لیکن اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بنانے والا کوئی دوسرا شخص ہے کیونکہ اگر خدا کا بنایا ہوا ہوتا تو ’’شروع ساتھ نام اللہ کے‘‘ ایسا نہ کہتا بلکہ ’’شروع واسطے ہدایت انسانوں کے‘‘ ایسا کہتا۔

یہ اعتراض کرنے سے پنڈت صاحب کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ اس میں مخاطب خدا ہے، اس لئے یہ خدا کا کلام نہیں ہوسکتا بلکہ انسان کا ہے کیونکہ اگر خدا نازل کرنے والا ہوتا تو قرآن شریف ایسی طرز سے شروع ہوتا جس میں یوں معلوم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ بول رہا ہے لیکن اس آیت سے اُلٹا یوں معلوم ہوتا ہے کہ بندہ بول رہا ہے اور خدا مخاطب ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ کلامِ انسانی ہے۔

جوابِ اوّل بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ سورۃ فاتحہ کی ایک آیت ہے اور سورۃ فاتحہ ایک دعا ہے جو انسان کو اللہ تعالیٰ نے سکھائی ہے تا وہ اسے خدا تعالیٰ کے سامنے پڑھ کر اپنا حال عرض کرے۔ چنانچہ عربی کے قاعدہ کے لحاظ سے بِسْمِ اللّٰہِ میں جو بات آتی ہے اس کا ایک متعلق مقدّر ضرور ماننا پڑے گا کیونکہ جملہ میں ’’با‘‘ کا متعلق ضرور آتا ہے جو کہ یا فعل ہوتا ہے یا معنیٔ فعل یا شبہ فعل۔ پس اس قاعدہ کے ماتحت بِسْمِ اللّٰہِ کا مقدّر متعلق جب ہم لگاتے ہیں تو فقرہ یوں بن جاتا ہے۔ اِقْرَأْ بِسْمِ اللّٰہِ یعنی میں اللہ تعالیٰ کا نام لے کر یہ دعا یا قرآن شریف پڑھتا ہوں۔ دوسرے ایک حدیث میں ہے۔ کہ کُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبْدَأْ بِسْمِ اللّٰہِ فَھُوَ اَقْطَعُ وَ اَبْتَرُ[1] جو کام اللہ کا نام لے کر شروع نہیں کیا جاتا وہ کبھی کامیاب اور سرسبز نہیں ہوتا۔ پس اس قرینہ سے اِقْرَأْ کے ابتداء کی تقدیر نکلے گی اور اس آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ میں اللہ تعالیٰ کے نام سے استعانت طلب کرتا ہوں اور اس کلام کو پڑھنا شروع کرتا ہوں یا اس کام کو کرتا ہوں۔ پس سورۃ فاتحہ ایک دعا ہے جو انسان کو سکھائی گئی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ دعا خدا کی طرف سے نہیں ہوتی بلکہ بندہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ اگر پنڈت صاحب کا یہ مطلب ہے کہ اس دعا میں اللہ تعالیٰ سائل ہوتا اور بندہ مسئول تب قرآنِ شریف خدا تعالیٰ کا کلام ثابت ہوتا تو آریہ سماج کو بہت جلد یہ اعتراض ستیارتھ پرکاش سے مٹا کر اہلِ عقل و دانش کی ہنسی سے بچنا چاہئے۔ کیونکہ ہمیشہ دعا بندہ کی طرف سے ہوتی ہے خدا کی طرف سے نہیں کیونکہ جو شخص سوال کرتا ہے، وہ محتاج ہوتا ہے اور جس سے سوال کیا جاتا ہے وہ محتاج الیہ۔ یعنی اس کے حضور میں دوسرے لوگ محتاج ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جس کے حضور میں کوئی کمی نہیں اور زمین و آسمان اور ذرہ ذرہ کا مالک ہے کسی کا محتاج نہیں ہوسکتا بلکہ اگر وہ محتاج ہو تو اس لفظ اللہ کا اطلاق اس پر نہیں ہوسکتا کیونکہ اللہ کے معنی ہیں ہر ایک خوبی سے متّصف اور ہر ایک عیب سے مبرا۔ اور کسی کا محتاج ہونا تو بڑا عیب ہے جو اللہ تعالیٰ میں نہیں پایا جاسکتا۔ پس میں نہیں سمجھتا کہ پنڈت صاحب کو اس اعتراض کرنے کا خیال ہی کیوں پیدا ہوا کیونکہ جب سورۃ فاتحہ ایک دعا ہے جو کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو سکھائی ہے تو ضرور تھا کہ وہ ایسے الفاظ میں ہوتی جس سے ظاہر ہوتا کہ بندہ عرض کرتا ہے اور مالک سن رہا ہے اس کی مثالیں دنیوی گورنمنٹ کے قواعد میں بھی کثرت سے مل سکتی ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ گورنمنٹ انگریزی نے بھی مختلف عرائض کے لئے خود الفاظ بنا کر دیئے ہیں اور لازمی ہوتا ہے کہ ہر ایک سائل جب کوئی درخواست کسی خاص محکمہ میں دے تو وہی الفاظ

استعمال کرے جو کہ گورنمنٹ نے اس عرضی کیلئے خود مقرر کئے ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ جو دفاتر کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں یا جنہیں کبھی کسی مقدمہ میں حاضر ہونا پڑا ہو، اس بات کو خوب جانتے ہیں۔ وکلاء کیلئے بھی ہائی کورٹوں نے خاص الفاظ مقرر کئے ہوئے ہیں کہ جو انہیں عدالت کے سامنے تقریر کرنے سے پہلے کہنے پڑتے ہیں۔ اسی طرح مختلف سوسائٹیوں میں داخلہ کیلئے خاص فارم پُر کرنے پڑتے ہیں اور یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ ہر ایک انسان سمجھ نہیں سکتا کہ کن الفاظ میں اپنا مَافِی الضَّمِیْر ادا کرے اور نہ وہ یہ جان سکتا ہے کہ کونسے الفاظ ضرر اور نقص سے پاک ہیں اس لئے دنیوی گورنمنٹیں بھی احتیاطاً خود درخواست کے الفاظ مقرر کر دیتی ہیں اور سائل کیلئے ضروری ہوتا ہے کہ ان الفاظ کو استعمال کرے تا کہ بہت حد تک نقصوں سے محفوظ رہے۔

اسلام کی ایک بہت بڑی خصوصیت

اسی فائدہ کو مدنظر رکھ کر اللہ تعالیٰ نے بھی ابتدائے قرآن میں سورۃ فاتحہ نہایت ہی پاک اور بے عیب الفاظ میں انسان کو سکھائی ہے تا کہ وہ اس کے ذریعہ سے اپنے ہر قسم کے مطالب کو اللہ تعالیٰ سے طلب کرے پس اس پر اعتراض کرنا تعصّب نہیں تو اور کیا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دعا کی وجہ سے مسلمان ہر ایک مذہب پر غالب ہیں اور کوئی مذہب نہیں جو اپنے پیراؤں کو ایسی پاک اور جامع دعا سکھا تا ہو جس میں مختصر الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی کُل صفات کا بیان بھی ہو، خالق اور انسان کے تعلقات بھی بیان کئے گئے ہوں، پھر انسانوں کے آپس کے تعلقات بھی مذکور ہوں اور پھر ایک جامع ومعنی دعا بھی ہو۔ یہ ایک اسلام اور صرف اسلام ہی ہے جس میں اپنے پیروؤں کو اس کامل دعا کا ہتھیار دیا گیا ہے اور چونکہ دعا کے ماتحت ہی نتائج نکلتے ہیں، اس لئے مسلمانوں کی طرح کوئی قوم خدا تعالیٰ سے نیک ثمرات کی امیدوار نہیں ہوسکتی۔

وید پر اعتراض

یہاں تک یہ ثابت کرنے کے بعد کہ چونکہ انسان دعا میں اپنے الفاظ میں پوری طرح محتاط نہیں ہوسکتا اس لئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سورۃ فاتحہ ایک کامل دعا سکھائی ہے اور یہ کہ اس کی مثال دنیوی گورنمنٹوں کے انتظام میں بھی ملتی ہے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پنڈت صاحب نے جو اعتراض قرآن پر کیا ہے وہی وید پر اُلٹ کر پڑتا ہے اور قرآن شریف میں تو صرف ایک قلیل حصہ ہے جو بطور حکایت از انسان بیان کیا گیا ہے لیکن وید سارے کا سارا اس الزام کے نیچے ہے اور چونکہ پنڈت صاحب اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ جس کلام کا کوئی حصہ انسان سے حکایتاً بیان ہو وہ کلامِ الٰہی نہیں ہوسکتا بلکہ انسانی کلام

ہوتا ہے، اس لئے ان کے پیرووٴں کو لازماً اقرار کرنا پڑے گا کہ وید خدا کا کلام نہیں ہے۔ چنانچہ رگوید جو سب ویدوں میں معتبر مانا گیا ہے، اس کا اکثر حصہ دیکھنے پر میں نے ایک بھی منتر ایسا نہیں پایا جس میں خدا متکلّم ہو اور بندہ مخاطب ہو بلکہ ہر جگہ بندہ بولتا ہے اور اللہ تعالیٰ مخاطب ہوتا ہے۔ پس بقول پنڈت دیانند صاحب وید خدا کا کلام نہیں ہوسکتا کیونکہ اگر خدا کا کلام ہوتا تو اللہ تعالیٰ بولنے والا ہوتا۔

مثال کے طور پر ہم رگوید کے چند منتر ذیل میں درج کرتے ہیں جس سے ناظرین پر کُھل جائے گا کہ پنڈت صاحب قرآن شریف پر اعتراض کرتے وقت کس قدر حق گوئی پر مائل تھے۔ چنانچہ رگوید اسٹک اوّل پہلا ادھیائے سکت اوّل کا منتر اس طرح شروع ہوتا ہے۔

(۱) ''میں اگنی دیوتا کی جو ہوم کا بڑا گرو کارکن اور دیوتاوٴں کو نذریں پہنچانے والا ہے اور بڑا اثروت والا ہے مہما کرتا ہوں''۔

اب ہر عقلمند غور کرسکتا ہے کہ جیسے قرآن شریف کے شروع میں بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہے اسی طرح وید کا شروع بھی اس رنگ میں کیا گیا ہے کہ بندہ بول رہا ہے اور خدا مخاطب ہے۔ پس جو انسان اس وید کے شروع میں اس منتر کو پڑھ کر پھر بھی اسے خدا کا کلام مانتا رہا ہے اور ہمیشہ ویدوں کی بڑائی کے گُن گا تا رہا ہے، کیسے شرم کی بات ہے کہ جب قرآن شریف کی طرف آتا ہے تو یہ بات اسے تعجب میں ڈال دیتی ہے اور بے اختیار چِلّا اُٹھتا ہے کہ ایسا کلام خدا کا کلام نہیں ہوسکتا۔ کاش! وہ غور کرتا اگر قرآن شریف ایسی چند آیتوں کی وجہ سے جو حکایتاً انسان سے بیان کی گئی ہیں خدا کا کلام نہیں ہوسکتا تو وید جو سارے کا سارا اِسی رنگ میں بیان کیا گیا ہے، خدا کا کلام کیونکر ہوسکتا ہے۔ ہاں ایک صورت ہوسکتی ہے اور وہ یہ کہ وید کے کُل منتروں کو خدا کا کلام تو مانا جائے لیکن یہ بھی یقین کیا جائے کہ ویدک عقیدہ کی رو سے دو خدا ہیں اور وید میں ایک خدا دوسرے خدا سے جو اس سے بڑا درجہ رکھتا ہے ہم کلام ہے۔ لیکن آریہ صاحبان امید نہیں کہ اس تجویز سے بھی متفق ہوسکیں۔

ویدک دعائیں یہ تو ابتدا کا حال ہے لیکن رگوید کو کہیں سے کھول کر دیکھ لو ہر جگہ بندہ خدا سے دعا کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ جس سے یقین ہوتا ہے کہ وید ہرگز خدا کا کلام نہیں بلکہ وقتاً فوقتاً ہندووٴں کے بزرگوں نے جو دعائیں کی ہیں، ان کا مجموعہ ہے۔ ہم مختلف جگہوں سے چند اور مثالیں درج کرکے دکھاتے ہیں کہ رگوید میں ایک بھی منتر نہیں جس میں خدا

متکلّم ہو اور بندہ مخاطب۔ چنانچہ انو کا ۲ سکت ۲ کا پہلا منتر یوں ہے۔

’’میں اِندر کے وہ بہادرانہ کام جو اُس نے یعنی میگراج نے پہلے زمانہ میں کئے ہیں بیان کرتا ہوں۔ اُس نے بادل کو چیرا، اُس نے مینہ برسایا، اُس نے ان ندیوں کے واسطے جو پہاڑ سے آتی ہیں راستہ بنایا‘‘۔

پھر انو کا ۱۲ سکت ا میں یوں لکھا ہے۔

’’استھر اور بھولے دیوتا۔ اے اگنی! تیرے قدموں کے کھوج لگاتے ہوئے تیرے پیچھے ہو لئے جب کہ تو نے اپنے دھن کو پانی ہی کے نشیب میں اس طرح چُھپا دیا جیسے مویشی کا چور اپنے تھن چُھپاتا ہے۔ اُن کو تیری اس لئے تلاش تھی کہ تجھ سے وہ بھوگ کا دعویٰ کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ تُو دیوتاؤں تک اس بھوگ کو پہنچائے۔ تمام دیوتا جو پوجا کے مستحق ہیں تیرے پاس بیٹھ گئے‘‘۔

انو کا ۱۳ سکت ا میں یوں لکھا ہے۔

’’یگ میں جلدی جا کر آؤ۔ ہم اگنی کی مہما میں منتر پڑھیں جو ہماری دُور سے سنتا ہے‘‘۔

اسی طرح ساتواں ادھیائے انو کا ۱۵ سکت ۲ میں ہے۔

’’تیری جو بڑا ابلوان ہے بڑی اور فتحمند روشنی آسمان میں پھیل جاتی ہے۔ اے اگنی! ہم نے تجھے دوشن کیا ہے ہمیں اپنی بے عیب اور رکشا کرنیوالی کلاؤں سے بچا‘‘۔

میں نے یہ چند منتر مختلف جگہوں سے اس لئے نقل کر دیئے ہیں کہ تا حق کے متلاشیوں کو معلوم ہو جائے کہ رگوید سارے کا سارا اسی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے اور کہ پنڈت دیانند جی کو بقول مسیح علیہ السلام اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آیا اور دوسرے کی آنکھ کے خواہ مخواہ تنکے نکالنے کی فکر میں پڑ گئے۔

قرآن کی ابتدا

پس قرآن شریف ضرور تھا کہ بِسْمِ اللّٰہِ سے شروع ہوتا۔ اس کے بعد ہم یہ ثابت کرتے ہیں کہ ضرور تھا کہ قرآن شریف اسی آیت سے شروع ہوتا اور اس آیت سے شروع ہونا قرآن شریف کیلئے کوئی عیب کی بات نہیں بلکہ اس کی سچائی کا ثبوت ہے۔ جب کوئی کام بھی انسان شروع کرتا ہے تو دو قسم کے اغراض اس کے مدنظر ہوتے ہیں، نیک یا بد۔ بعض لوگ بدنیتی سے کام شروع کرتے ہیں اور بعض نیک نیتی سے۔ اسی طرح بعض اپنی ذاتی اغراض کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے نفس پر یا دوسرے اسباب پر بھروسہ رکھتے

ہیں اور خدا کی طرف توجہ نہیں کرتے لیکن غور کر کے دیکھا جائے تو ماننا پڑتا ہے کہ اس کام میں برکت ہو سکتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکت ہے۔ کیسے شرم کی بات ہے کہ ایک آدمی خدا تعالیٰ کے بنائے ہوئے ہاتھوں سے کام کرے، اُس کے دیئے پیروں سے چلے، اُس کی عطا کردہ آنکھوں سے دیکھے، دماغ سے غور کرے اور پھر اپنے نفس پر بھروسہ کرے۔ بعض دفعہ یوں بھی ہو جاتا ہے کہ انسان اوّل تو نیک نیتی سے کام شروع کرتا ہے، بعد میں نیت بدل جاتی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ہم کو سکھایا کہ قرآن شریف پڑھنے سے پہلے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھنی چاہئے اور ہر ایک سورۃ کے شروع میں یہ آیت نازل فرما کر انسان پر یہ لازم کر دیا کہ ابتدا اِسی آیت سے ہو۔ پھر حدیث کے ذریعہ ہر ایک بڑے کام سے پہلے اس کا پڑھنا سنت ہوا۔

بِسْمِ اللّٰہِ کے معنی اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ میں یہ کام اپنے نفس کے لئے نہیں کرتا اور کوئی گندی اور ناپاک ناجائز خواہشات کو دل میں چُھپائے ہوئے شروع نہیں کرتا بلکہ میں اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اور اسی پر بھروسہ کر کے اور اسی سے اس بات کی مدد مانگتے ہوئے کہ وہ مجھے ہر ایک قسم کی بدنیتوں اور شرارتوں سے بچائے، شروع کرتا ہوں۔ اب بتاؤ کہ کیا یہ پاک الفاظ اس قسم کے ہیں جن پر اعتراض ہو سکے۔ ان مختصر سے الفاظ میں کیسے معارف بھر دیئے گئے ہیں کہ کوئی کتاب ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وید کی ابتدا ابھی مَیں اُوپر درج کر چکا ہوں کہ آگ کی تعریف سے شروع ہوتا ہے، تورات اور انجیل کی ابتدا بھی نظروں سے پوشیدہ نہیں، پھر قرآن شریف کی ابتدا کو بھی دیکھو کہ کس طرح ہوئی ہے اور پھر غور کرو کہ کیا یہ خدا کا کلام ہے یا وہ۔ ان تین چار الفاظ میں کس طرح انسان کو نیت صاف رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، پھر خالص خدا پر بھروسہ کرنے کا حکم ہے، پھر یہ ہدایت ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہر ایک کام کے شروع میں مدد اور استعانت طلب کرنی چاہئے تا کہ انسان راہ سے گمراہ نہ ہو جائے اور جادۂ اعتدال سے اُس کا پاؤں دوسری طرف نہ پھر جائے۔ کیا اس کلام کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خدا کا کلام نہیں تو پھر اور کون سا کلام خدا کا ہو سکتا ہے؟

دوسرا اعتراض پھر اسی آیت میں پنڈت صاحب دوسرا اعتراض یوں کرتے ہیں کہ اگر اس آیت کے یہ معنی مان لئے جائیں کہ انسان کو حکم ہے کہ تُو ہر ایک کام کی ابتدا میں یہ آیت پڑھا کر تو پھر گناہوں کی ابتدا بھی اسی آیت سے لازم آئے گی۔

چنانچہ اسی وجہ سے مسلمان گائے وغیرہ کے ذبح کے وقت یہ الفاظ کہتے ہیں۔

جوابِ اوّل اللہ تعالیٰ نے اس جگہ قطعاً یہ بیان نہیں فرمایا کہ ہر ایک کام کی ابتدا کے وقت یہ آیت استعمال کی جائے بلکہ یہاں تو سورۃ فاتحہ کی ابتدا میں فرمائی ہے۔

جوابِ دوم جیسا کہ اوپر بیان کر چکا ہوں یہ آیت تو ابتدائے قرآن میں اس لئے رکھی گئی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ الٰہی! تُو مجھے ہر ایک بدی سے محفوظ رکھ اور گناہ سے بچا اور مَیں سب قسم کی بدکاریوں میں پڑنے سے بچنے کے لئے تیرے نام سے برکت طلب کرنا اور تیری استعانت کا خواہاں ہونا مناسب اور ضروری سمجھتا ہوں پھر یہ آیت گناہ کی ابتدا میں کس طرح پڑھی جاسکتی ہے۔

جوابِ سوم اگر اللہ تعالیٰ نے اسلام میں بدیوں کو اور گناہوں کو جائز قرار دیا ہوتا تب تو یہ اعتراض پڑتا، لیکن جب اسلام کا خدا ہر ایک مسلمان کو قطعی حکم دیتا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَ اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ[۲] یعنی اے انسان! اللہ تعالیٰ عدل اور احسان اور قریبیوں سے سلوک کرنے کا حکم کرتا ہے اور ایسی باتوں سے جو فحش ہوں جو لوگوں کیلئے ایذاء رساں ہوں، جن سے حُکّام یا ماتحتوں کے حقوق تلف ہوتے ہوں، منع کرتا ہے تو باوجود ایسے صریح حکم کے جو شخص بدیوں میں مبتلا ہے وہ مسلمان کب رہ سکتا ہے اور اسلام پر کیا الزام؟

تیسرا اعتراض ایک اور اعتراض پنڈت جی نے یہ کیا ہے کہ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ داخل ہو بیچ اسلام کے۔ (بقرہ آیت ۲۴)

محقق: اگر مسلمانوں کے مذہب میں داخل ہونے سے خدا راضی ہوتا ہے تو وہ مسلمانوں ہی کا طرفدار ہے سب دنیا کا خدا نہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہ قرآن خدا کا بنایا ہوا ہے، نہ اس میں کہا ہوا خدا ہوسکتا ہے۔

جواب اوّل تو پنڈت صاحب نے آیت کا ترجمہ ہی غلط کیا ہے۔ آیت تو یہ ہے یٰٓـاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً[۳] اے وہ لوگو! جو ایمان لائے تمام کے تمام کامل فرمانبرداری اور سلامت روی کے طریقوں کو اختیار کرو۔ ورنہ جب کہ وہ پہلے ہی مسلمان تھے تو اس کے کیا معنی ہوئے کہ اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ یہ ظاہری ایمان کے بعد

حقیقی اخلاص اور نیکی کی تعلیم دی گئی ہے۔ دوسرے اگر بفرضِ محال پنڈت صاحب کے اعتراض کو پر کھنے کیلئے اس ترجمہ کو صحیح بھی قرار دے دیا جائے، تب بھی اعتراض فضول اور خلافِ عقل ہے کیونکہ جب خود پنڈت دیانند صاحب کا بھی یہی اعتقاد تھا کہ آریہ مذہب میں داخل ہو کر ہی نجات مل سکتی ہے اور بغیر ویدوں کے ماننے کے انسان سُرخرو نہیں ہوسکتا ہے کیا ان کے اعتقاد پر یہ اعتراض نہ وارد ہوگا کہ کیا خدا صرف ویدوں کے ماننے سے خوش ہوتا ہے۔ کیا وہ آریوں کا طرفدار ہے؟ اور پھر ہر ایک سچائی پر اعتراض ہوگا کہ کیا خدا اس سچائی کا طرفدار ہے۔ جب اسلام کا دعویٰ ہے کہ کُل سچائیاں اس کے اندر پائی جاتی ہیں تو کیا یہ کہا جائے کہ اسلام کے باہر جس قدر گند ہیں، ان پر بھی اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے اور ان میں ملوث انسان کو نجات عطا کرتا ہے۔ جب آریوں کا ویدوں کی نسبت یہی عقیدہ ہے تو پنڈت صاحب کو اسلام پر اعتراض کرنے کی کیا سُوجھی۔ سچ ہے

نیش عقرب نہ از پے کین است
مقتضائے طبیعتش این است

چوتھا اعتراض جو کچھ آسمان اور زمین پر ہے سب اسی کیلئے ہے۔ (سورہ بقرہ:۲۵۶) محقق۔ جو آسمان اور زمین پر چیزیں ہیں وے سب انسانوں کے واسطے خدا نے پیدا کی ہیں اپنے واسطے نہیں۔ کیونکہ اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ (صفحہ ۸ ۷۴)

جواب جس آیت پر پنڈت صاحب نے اعتراض کیا ہے وہ یہ ہے لَـهٗ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ [۴] یعنی جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے سب اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے اور یہی اعتقاد زبانی طور سے آریوں کا بھی ہے اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی انسان جو اللہ تعالیٰ کے وجود پر ایمان رکھتا ہو یہ کہے کہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں نہیں ہیں بلکہ کسی اور کے قبضہ میں ہیں۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں ایک سچائی کا بیان کیا ہے تو اس پر پنڈت صاحب کو کیا اعتراض ہے۔ یہ زیادتی انہوں نے کہاں سے نکالی کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اسے خدا خود استعمال کرتا ہے اور بندوں کی طرح ان اشیاء کا محتاج ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر تو نہیں کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اشیاء کس لئے پیدا کی ہیں بلکہ یہ لکھا گیا ہے کہ یہ سب اشیاء کس کی ملکیت میں ہیں۔ اور ان اشیاء پر خدا تعالیٰ کی ملکیت کا انکار خود آریہ صاحبان بھی نہیں کرتے پھر یہ اعتراض نہ معلوم کیا سوچ کر کیا گیا ہے۔ شاید کہہ دیا جائے کہ یہ پریس کی غلطی تھی، پنڈت صاحب نے یہ اعتراض نہیں کیا تھا بلکہ بعض حاسدوں نے اپنی طرف سے ملا دیا لیکن

بات تب درست ہوگی کہ جب آریہ پرتی ندھی سبھا اس اعتراض اور اس طرح دیگر کُل اس قسم کے اعتراضات کے اِخراج کا ریزولیوشن پاس کرے اور آئندہ ایڈیشن میں ستیارتھ پرکاش میں وہ درج نہ کئے جائیں۔

پانچواں اعتراض اورنہیں ہے اللہ کہ خبردار کرے تم کو اوپر غیب کے لیکن اللہ پسند کرتا ہے پیغمبروں اپنے میں سے جس کو چاہے پس ایمان لاؤ اوپر اللہ کے اور اس کے رسولوں کے (سورہ آل عمران: ۱۷)

محقق۔ جب مسلمان لوگ سوائے خدا کے کسی پر ایمان نہیں لاتے اور نہ کسی کو خدا کا شریک مانتے ہیں تو پیغمبر صاحب کو کیوں خدا کے ساتھ ایمان میں شریک کیا ہے؟ اللہ نے پیغمبروں پر ایمان لانا لکھا ہے اسی لئے پیغمبر بھی شریک ہوگیا۔ پھر لَا شَــرِیْکَ کہنا ٹھیک نہ ہوا۔ اگر اس کا مطلب یہ سمجھا جائے کہ محمد صاحب کے پیغمبر ہونے پر ایمان لانا چاہئے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ محمد صاحب کی کیا ضرورت ہے۔ اگر خدا بلا پیغمبر کے اپنی خواہش کے مطابق کام نہیں کرسکتا تو ضرور خالی از قدرت ہوا۔ (صفحہ ۶۸۲)

جواب اس اعتراض میں پنڈت صاحب نے دو ایجادیں کی ہیں اور دونوں عجیب ہیں اوّل تو یہ کہ خدا کے سوائے کسی اور پر ایمان لانا بڑا گناہ ہے اور شرک ہے لیکن آپ کو یہ سمجھ نہیں آئی کہ ایمان کہتے ہیں ماننے کو۔ کیا پنڈت دیانند صاحب کے پیرو بتا سکتے ہیں کہ وہ خدا کے سوائے کسی اور چیز کو نہیں مانتے؟ اگر ایسا ہے تو خود آریہ سماج ہی کا ماننا اور یہ کہنا کہ آریہ سماج کوئی چیز ہے، شرک ہو جائے گا۔ کیونکہ وجود میں خدا اور آریہ سماج برابر ہو جائیں گے اور اگر خدا کے سِوا کسی اور کی فرمانبرداری شرک ہے یا کسی کی بات ماننی شرک ہے تو والدین کی فرمانبرداری اور گورنمنٹ کی اطاعت اور خود پنڈت دیانند کی اتباع اور ویدوں کا اقرار سب شرک ہوگا اور کوئی کام نہ رہے گا جس میں شرک نہ ہو۔ کھاتے پکاتے ہوئے شرک کرنا پڑے گا کہ ایک چیز آگ ہے پھر وہ جل کر دوسری اشیاء کو پکا دیتی ہے۔ پھر ایک چیز آٹا ہے جو کھانے سے پیٹ کو بھر دیتا ہے اور ان تمام اشیاء کا وجود ماننا اور ان کے خواص پر بھی یقین لانا شرک ہوگا۔ خود شرک کا ماننا یعنی شرک پر ایمان لانا شرک ہو جائے گا۔ پانی پیتے ہوئے پانی کے وجود کا ایمان اور اس کے خواص پر یقین بھی شرک ہوگا اور ایک عجیب دورِ تسلسل ہو جائے گا۔ شرک کی یہ تعریف تو نہیں کہ خدا کے سوائے کسی اور چیز کو نہ مانا جائے بلکہ شرک کی اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ اُن صفات

میں کسی کو خدا کا شریک کرنا جو اُس کے لئے خاص ہیں اور جس میں کسی کا دخل نہیں ہے۔ یا اُس حد سے زیادہ کسی کو صفاتِ الٰہیہ میں شریک کرنا جو اُس نے مخلوقات اور مصنوعات میں ودیعت کی ہیں۔شرک اوّل کی مثال خلق ہے کہ اِس میں اُس نے کسی کو شریک نہیں کیا اور شرک دوم کی مثال سمع ہے کہ اُس نے انسانوں اور حیوانوں میں سمع کی طاقت رکھی ہے لیکن ایسی طاقت کسی کو نہیں دی کہ انہی کانوں کے ساتھ کُل دنیا کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی آوازوں کو سن لے۔ پس کسی کو خالق ماننا یا اِس قسم کا سمیع ماننا کہ کُل باریک اور موٹی، خفی اور جلی، آہستہ اور اونچی سب آوازوں کو یکدم سن لیتا ہے، شرک ہوگا نہ کہ کسی کا محض وجود ماننا یا کسی کا عام فرمانبرداری شرک ہوگی۔ دوسری بات جو پنڈت صاحب نے اس آیت سے نکالی ہے یہ ہے کہ اگر ایمان کے معنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا ماننا ہے جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے تو اس پر دوسرا اعتراض یہ پڑتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرورت کیا تھی اور جب کہ آپ کی خدا کو کوئی ضرورت تھی اور آپ کے بغیر خدا کوئی کام نہ کرسکتا تھا تو ضرور خدا قدرت سے خالی ہوا۔ لیکن اس اعتراض کے کرتے وقت اپنے گھر کا خیال پنڈت جی کو نہیں رہا۔ ان کو یاد رکھنا چاہئے کہ وہ بھی ایک کی جگہ چار رشیوں کو قبول کرتے ہیں۔ پس یہی اعتراض ان پر بھی پڑے گا کہ ان چار رشیوں کی ضرورت کیا تھی۔ کیا پرمیشور اِن کے بغیر کام نہیں کرسکتا تھا اور وید اِن کے سوائے نہیں بھیج سکتا تھا اور اگر نہیں بھیج سکتا تھا تو پرمیشور بے قدرت ہوا۔ بلکہ خود یہی کیوں نہ کہیں کہ کیا ویدوں کا خدا محتاج تھا اور کیا ان کے بغیر دنیا کو ہدایت نہیں دے سکتا تھا؟ اگر نہیں تو ویدوں کا محتاج ہوا۔ لیکن کیا آریہ صاحبان اس قسم کے بیہودہ اعتراض کو اپنے رشیوں یا اپنی کُتب کی نسبت برداشت کریں گے؟ اگر نہیں برداشت کرسکتے تو پھر قرآن شریف پر ان کے اعتراض کرنے کے کیا معنی؟ یہ اعتراض تو ''مشتے نمونہ از خروارے'' ہیں۔ اگر آدمی جواب لکھنے لگے تو چودہ موداس[6] سارے کا سارا غلط اور بے بنیاد اعتراضات سے بھرا ہوا ہے۔ (الفضل ۲۳ فروری ۱۹۳۳ء)

۱؎ کنزالعمال جلد ۱ صفحہ ۵۵۵ مکتبۃ التراث الاسلامی حلب میں یہ الفاظ آئے ہیں ''کُلُّ أَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَا یُبْدَءُ فِیْهِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اَقْطَعُ''۔

۲؎ النحل:۹۱ ۳؎ البقرۃ: ۲۰۹ ۴؎ البقرۃ: ۲۵۶

۵؎ ال عمران: ۱۸۰ ۶؎ چودھواں سملاس (ستیارتھ پرکاش کا چودھواں باب)